Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 29, Sr. No.73, 2008, pp 61 - 72

تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۲۹، عدد ۱۔۴، شمارہ ۷۳، ۲۰۰۸ء

ترجمے کا فن

خالد ندیم☆

Abstract

Translation is a vehicle to transform the thinking and literary experiments in shape of text into other languages for the benefit of the comparatively less developed thinking or literary outlooks.Literature of the world speaks volumes about the tradition of translation. Almost all the great figures in literature, philosophy and science have been in favor of translation from one language to other languages and some of them have also rendered translations themselves. Despite its inevitability in the diffusion of knowledge, its status as an established form of literature is yet a question mark.

تاریخ عالم بتاتی ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کے علوم وفنون سے اخذ وقبول کا سلسلہ کم وبیش ہمیشہ سے جاری ہے۔ بالعموم یہ آسان نہیں ہوتا کہ کوئی قوم دیگر زبانوں یا تہذیبوں سے بالکل بے نیاز ہوکر ترقی کی منازل طے کرلے۔ اقوام کے درمیان تہذیبی وثقافتی اور علمی وادبی لین دین اور تعامل میں ترجمہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ترجمے کے عمل کو دو زبانوں کے مابین ایک پُل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ترجمہ ایسا دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں۔(۱) گویا دو لسانی گروہوں کے درمیان باہمی مکالمے کی صورت ترجمے (یا ترجمان) ہی

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

کے ذریعے ممکن ہے۔ علمی و ادبی اعتبار سے ترجمہ کسی زبان پر کیے گئے ایسے عمل کا نام ہے، جس میں کسی اَور زبان کے متن کی جگہ دوسری زبان کا متبادل متن پیش کیا جائے۔(۲) تاہم مظفر علی سید کا کہنا ہے کہ عربی تعریف کے مطابق ترجمہ 'نقلِ کلام' ہے، جو نقلِ مطالب یا نقلِ معانی نہیں۔ نقل کلام کا تقاضا یہی ہے کہ کلام جس زبان میں نقل ہو، اُس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا ہو جیسا اصل زبان میں ہوا تھا۔(۳) یعنی ترجمہ متبادل متن ہی کا مطالبہ نہیں کرتا، متبادل تاثر و کیفیت کا بھی متقاضی ہے۔ گویا ترجمے کا عمل ایک علمی و ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں دِکھانا ہے اور وہ بھی اس احتیاط و خوبی سے کہ اس کا ڈیل ڈول، شکل و شباہت، ناز و انداز اور جزئیات و خیالات پورے طور پر منتقل ہو جائیں۔(۴) چناں چہ ڈاکٹر سید عابد حسین کے مطابق ترجمے کو ادبی قدر و قیمت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ایک زبان سے دوسری زبان میں مفہوم کے ساتھ وہ آب و رنگ، وہ چاشنی، وہ خوش بو، وہ مزہ بھی آ جائے، جو اصل عبارت میں موجود تھا۔(۵)

ترجمے کے باب میں یہ ساری خواہشات نہایت ہی مستحسن سہی، لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں اور نہ ہی کوئی ترجمہ آج تک اس معیار پر پورا اُتر سکا ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو ترجمے کو تخلیق سے کمتر یا دوسرے درجے کی علمی و ادبی سرگرمی قرار نہ دیا جاتا۔

جب بات شاعری کی ہو تو مطالبات مزید بڑھ جاتے ہیں۔ ترجمہ تو خود ایک پیچیدہ عمل ہے اور شاعری کے سلسلے میں، رابرٹ فراسٹ کے خیال میں، جو چیز ترجمے میں آنے سے رہ جاتی ہے، وہ دراصل شاعری ہی ہے۔ سحر انصاری کے مطابق کسی نے ییٹس سے کہا کہ آپ کی فلاں نظم میری سمجھ میں نہیں آئی، تو انھوں نے جواب دیا۔ کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ جو الفاظ مَیں نے نظم میں استعمال کیے ہیں، اُن کے علاوہ دوسرے لفظوں میں اس بات کو بیان کروں، تو آپ سخت غلطی کر رہے ہیں۔' شاعری کے ترجمے کے بارے میں ایک اَور قول بھی بہت مشہور ہے کہ شاعری کا ترجمہ اُس محبوبہ کی طرح ہے، جو خوب صورت ہو تو وفادار نہیں ہوتی اور وفادار ہو تو خوب صورت نہیں ہوتی۔(۶)

ترجمے کا عمل کسی فن پارے کو پورے طور پر کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے، جب کہ بعض اوقات ترجمے کی پیچیدگیوں، تصنیفی ضروریات یا طباعتی مشکلات کے پیش نظر مکمل ترجمے کے بجائے کسی تصنیف کے مکمل یا جزوی نظریات و افکار سے کام لینے میں سہولت محسوس کی جاتی ہے اور مترجم فن پارے سے اپنے مقصد و مطلب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ترجمہ، ترجمہ نہیں رہتا، بلکہ اخذ و تألیف یا تلخیص کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ترجمے کا بنیادی تقاضا کسی تصنیف کے خیالات و افکار کے ساتھ ساتھ اس تصنیف میں پوشیدہ تمامتر تہذیبی و ثقافتی رویے، مذہبی و سیاسی نظریات، معاشرتی و معاشی تصورات، لسانی و اسلوبیاتی خصوصیات، حتیٰ کہ مصنف کے طرزِ احساس کی منتقلی ہے۔

چونکہ ترجمہ دو تہذیبوں کے درمیان خلیج کو پاٹنے کا کردار ادا کرتا ہے اور بعض اوقات ترجمہ ہی کسی تہذیب یا قوم کے علوم سے شناسائی کا واحد ذریعہ ہوتا ہے، جس طرح بعض ناپید یونانی کتب کا نام محض اپنے عربی تراجم کی بدولت ہی زندہ ہے، اس لیے مترجم کی ذِمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔

مترجم کے لیے تصنیف اور ترجمے کی زبان پر یکساں عبور ضروری ہے۔ مصنف کے خیال کو گرفت میں لا کر اُسے اپنی زبان کے تمام تر امکانات کے مطابق زیبِ قرطاس کرنے میں ہی اس کا کمال ہے۔ اگر وہ مصنف کے الفاظ کے پس منظر میں پوشیدہ رُوح کو نہ پا سکے، یا متن کی رُوح کو سمجھنے کے بعد ترجمے کی زبان میں نہ لا سکے تو وہ کام یاب مترجم نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح جب تک کوئی شخص متواتر اور پے در پے زبان کی نزاکتوں اور اسلوبیاتی نظام پر غور نہیں کرتا اور جب تک اپنے افکار کو مختلف اور گوناگوں انداز سے لفظوں کی معرفت سامنے لانے کی مشق و مزاولت بہم نہیں پہنچاتا، اُس وقت تک وہ ترجمے کی ذِمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ (۷) چنانچہ مترجم کے لیے اسی پائے کے علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس کتاب اور

فن پارے کے مصنف کا ہو۔ اصل مصنف کے اندازِ بیان اور لسانی خصوصیات کے علاوہ اگر اس کے تعلیمی معیاروں، اس کے عام حالاتِ زندگی اور اس سے متعلق اس کے نقطہ نظر اور عصری تقاضوں سے جس قدر واقفیت ہوگی، اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔(۸)

بقول مظفر علی سید، ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دُہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ متن کی زبان اور اپنی زبان تو خیر آنی ہی چاہیے، اُس موضوع سے بھی طبعی مناسبت درکار ہے، جو متن میں موجود ہے؛ مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور اس صنفِ ادب یا شاخِ علم سے بھی، جس سے متن پیوست ہے، مترجم کو پیوستگی حاصل ہو، تب شاید ترجمہ چالو معیار سے اوپر اُٹھ سکے۔(۹)

یہ حقیقت ہے کہ مترجم جب کسی کتاب کو ترجمے کے لیے منتخب کرتا ہے تو لاشعوری طور پر وہ اُس زبان، اُس کتاب اور اس کے افکار ونظریات کو اپنی زبان اور اپنے ادب سے برتر تسلیم کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات، علمیت اور اپنے خیالات وتصورات پر مصنف کو فوقیت دیتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آ سکتا ہے، جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت سے انکار ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے۔ (۱۰)

چنانچہ مترجم کو اصل کی نقل کرنے میں ایک مصور اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ہلاک ہونا پڑتا ہے، اس کے ساتھ تالیاں بجانا، قہقہے لگانا اور کراہنا پڑتا ہے، اور یہ سب کر لینے کے باوجود پوری طرح سنجیدہ اور لیے دیے رہنا پڑتا ہے۔ تب جا کر ایک آرٹ بنتا ہے اور تخلیقی درجہ حاصل کرنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔(۱۱) اس کے باوجود کسی اچھے سے اچھے ترجمے کو بھی تصنیف کا قائم مقام سمجھنے میں ہمیشہ ہچکچاہٹ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ مظفر علی سید کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف ادوار میں ایک ہی کلاسیکی کارنامے کے نئے ترجمے نمودار ہوتے ہیں،

مگر کسی بھی ترجمے کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ ان ترجموں کو بھی نہیں، جن کو اپنے زمانے میں تخلیق سے بہتر خیال کیا گیا ہو۔(۱۲)

کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ مترجم کی حیثیت مصنف کے مقلد کی ہے اور مصنف کے قدم سے قدم مِلا کر چلنے میں ہی مترجم کی کام یابی ہے، یعنی مترجم کی حیثیت ایک تخلیق کار سے کمتر درجے کی ہے۔ اکثر ناقدین کے ہاں مترجم کے بارے میں یہی روّیہ مِلتا ہے، بلکہ ایک یونانی مقولے کے مطابق ترجمہ ایک بھُنی ہوئی سڑابری کی طرح ہے، یعنی بُھننے کے عمل سے سڑابری کا ذائقہ جس حد تک تبدیل ہو جاتا ہے، کسی تصنیف میں ترجمے کے بعد اُسی حد تک تبدیلی رُونما ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ساری دُنیا میں اسے طبع زاد ادب کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چیز شمار کیا جاتا ہے۔(۱۳)

تاہم اس نوعیت کی رائے کا اظہار کرنے والے حقیقی ترجمے کے پیچھے کارفرما رُوح کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میرزا ادیب کے خیال میں ہر ادب پارے کی اپنی بو باس ہوتی ہے۔ یہ بو باس اس فضا میں رچی بسی ہوتی ہے، جس میں ایک مصنف سانس لیتا ہے۔ یہ بوباس ایک خاص خطہ ارض میں بسنے والے لوگوں کی زندگی سے متعلق اجتماعی رویے سے پھوٹتی ہے۔ یہ روّیہ معاشرتی زندگی کے خاص تجربات اور مشاہدات سے برروے کار آتا ہے اور جب ایک مترجم کسی مصنف کی تحریر کو ان عناصر کے ساتھ اپنی زبان میں لے آتا ہے تو اس کی یہ کوشش ثانوی درجے سے بلند ہو کر تخلیقی ادب کی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔(۱۴) اسی لیے امریکہ میں ترجمے کے لیے دوبارہ تخلیق (Re-creation) کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔(۱۵) چناں چہ ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے، اس لیے کہ ترجمہ سے متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش کرنا نہیں، بلکہ ان افراد کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے، جو دوسری زبان کو نہیں جانتے۔(۱۶)

یہ مترجم کی بدنصیبی ہے کہ ایک طرف اس کی جان کاہی کو تخلیق کے برابر نہیں سمجھا جاتا تو دوسری جانب ترجمہ کرتے ہوئے اُسے پُل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ دوسروں کی زبان کے الفاظ اور لسانی تشکیلات میں پوشیدہ مفہوم اور تجربے تک پہنچنا اور پھر اس کی رُوح کو زندہ رکھتے ہوئے اسے کسی دوسری زبان کے پیکر لفظی میں ڈھالنا اتنا آسان نہیں ہے، جتنا بہ ظاہر نظر آتا ہے۔ یہ فن اس لیے بھی مشکل ہے کہ دوسری زبان کے نامانوس مزاج، عجیب لہجے اور سانچے میں ڈھلے ہوئے جملوں کی نئی ترکیب اور ساخت سے آشنا ہو کر اسے اپنے مزاج میں ڈھالنا، اپنے لہجوں سے ہم آہنگ کرنا اور پھر لفظوں کا اصل لباس اُتار کر نئے ماحول اور نئی زبان کے الفاظ کا لباس پہنانا، کہ قلبِ ماہیت مضحکہ خیز بھی نہ بن جائے اور مسخ بھی نہ ہو، کوئی آسان کام نہیں۔ پھر اصل مصنف کے مزاج، لب و لہجے اور طرزِ احساس کو سلامت رکھ کر اس طرح ترجمہ کرنا کہ اجنبیت کا احساس بھی باقی نہ رہے، واقعی مشکل مرحلہ ہے۔(۱۷) چنانچہ مترجم، جسے ایک وقت تک 'نمک حرام'، 'غدار' اور 'منحرف' قرار دیا گیا، اپنے کام کی بدولت بین الاقوامی اور بین التہذیبی روابط میں اہم مقام کا مستحق ہے۔ علمی، ادبی اور لسانی اعتبار سے وہ مختلف مراتب کا حامل ہوسکتا ہے، لیکن اپنے کمال کے ساتھ وہ آج بھی علم و ادب کا اہم رُکن تصور کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تہذیبی و علمی میدانوں میں ترجمے کی اہمیت و کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل انسانی تہذیب کی ترقی کسی ایک گروہ سے وابستہ نہیں۔ اس کی ترقی مجموعی انسانی ترقی ہے اور اس ترقی میں ترجمے کا بڑا ہاتھ ہے۔ غلام ربانی آگرو کے خیال میں تراجم کے ذریعے زبان و ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی سطح پر دوسری لسانی برادریوں کے ساتھ مفاہمت، افہام و تفہیم، یگانگت اور اتحاد کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔(۱۸)

یہ بھی ہے کہ جب کسی قوم کا تخلیقی عمل سست روی کا شکار ہو اور نئے نظریات اور جذباتی پیرایوں کی تشکیل و تدوین کی اہلیت کسی قدر سلب ہو چکی ہو تو اس وقت خیالات کی ترویج اور

نظریات کی تشکیل غیر ملکی ادب ، فلسفہ اور دیگر شعبہ ہائے تخلیقات کے ذریعہ متواتر تراجم کی ضرورت نہ صرف ایک اجتماعی تقاضے کی سطح پر اُبھرتی ہے، بلکہ ادبی اور علمی سطح پر بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔(۱۹) ایسے دَور میں قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعے دُنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے ،قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر یہی ترجمے تصنیف و تألیف کے جدید اسلوب اور آہنگ سجائیں گے۔(۲۰)

اس سے نہ صرف یہ کہ خیالات و افکار میں تازہ جھونکے محسوس ہونے لگتے ہیں، بلکہ زبان و بیان کے پُرتعفن تالاب میں تازہ پانی کی آمیزش شروع ہو جاتی ہے، چنانچہ ترجمے کے ذریعے زبان کئی اعتبار سے پھلتی پھولتی ہے۔ ترجمہ جہاں الفاظ اور زبان کی نشو ونما کے ذریعے انسانی علوم میں اضافے کا باعث بنتا ہے، وہیں ذہنی سرحدوں کو بھی کشادگی بخشتا ہے۔ زبان کی سطح پر ترجمہ خیالات و جذبات کی ہر ہر کروٹ کو سمونے کی خاطر نت نئے اسالیبِ بیان سے متعارف کرواتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت جہاں نئے الفاظ، استعاروں کے رُوپ میں جنم لیتے ہیں، وہیں پرانے اور برتے ہوئے الفاظ کو آکسیجن مہیا ہوتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محاکات کے جنم کے ساتھ نئے علوم وفنون سے آشنائی ہوتی ہے۔ ہمیشہ نئی اصنافِ ادب کا ورود ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہو سکا ہے۔(۲۱) چنانچہ احیائے علوم کی تحریکوں کے پیچھے یا کسی قوم کے فکری اور شعوری ارتقا میں ہمیں ترجموں کا کردار بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے دَور میں یونانی علوم کے تراجم، یورپی احیائے علوم کی تحریک کے پس منظر میں اسلامی علوم کے تراجم، ہر دوصورتِ حال اس بات کا ثبوت ہیں کہ فکر وشعور کی بلندی اور تہذیبی تحریک میں ترجمے خاص کردار ادا کرتے ہیں۔(۲۲)

ادبیاتِ عالم کا ارتقا بڑی حد تک تراجم ہی کا مرہونِ منت ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے خیال میں جس طرح دِیے سے دِیا جلتا ہے، اسی طرح علوم سے علوم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر دُنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کو ٹٹولا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی نشوونما کے مختلف مرحلوں میں دوسری زبانوں کے اثر کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔(۲۳) چنانچہ تراجم کے زیر اثر زبانیں اور تہذیبیں پہلے سے زیادہ باثروت اور وسعت پذیر دِکھائی دینے لگتی ہیں، اور ان میں اظہار کے نئے نئے وسائل جنم لینے لگتے ہیں، اس کے باوجود تیسری دُنیا میں ، جہاں اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے، ترجمے کو اَب تک حقارت کی نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے، حالاں کہ یہ 'حقیر' کام کم سے کم مغرب میں ایسے لوگوں نے بھی انجام دیا ہے، جو اپنی اپنی زبانوں کی آبرو تھے۔ انگریزی میں چوسر سے لے کر ڈرائیڈن ، پوپ، کولرج اور براؤننگ تک اور بیسویں صدی میں لارنس، ییٹس ، پاؤنڈ، ایلیٹ، آڈن اور بیکٹ تک نے یہ کام کیا ہے۔ بیسویں صدی کے اردو ادب میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے نثری ادب کا ترجمہ کیا اور اقبال سے لے کر فیض ، راشد، فراق، میراجی، مجید امجد اور شان الحق حقی جیسے شاعروں نے شعری ادب کے تراجم کیے ۔ ان میں کون ہے، جس نے کسی بھی دوسری شخصیت کا ضمیمہ بننا قبول کیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیقِ ادب کے مقابلے میں ترجمے کا کام نفی خودی کا مظہر ہے، لیکن سوچنے کی بات ہے کہ پھر یہ کام اثباتِ خودی کے پیغمبر حضرت علامہ نے کیوں انجام دیا؟ شاید اس لیے کہ اسرارِ خودی سے ہی نہیں، رموزِ بے خودی سے بھی ان کا رشتہ اتنا ہی گہرا تھا۔(۲۴)

اقبال سمیت دُنیا کے عظیم فن کاروں کا ترجمے کی طرف رجحان جہاں ترجمے کی وقعت کو بڑھانے کا باعث بنا ہے ، وہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ تخلیق کے میدان میں

ترجمے کی اہمیت تخلیق سے کم تر نہیں، بلکہ تخلیق کے ساتھ ساتھ ہے، تاہم اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مترجم کو متعلقہ زبانوں کے اصول، قواعد، محاورات، مقامی لفظیات، تراکیب، تشبیہات و استعارات، علائم و رموز، اصطلاحات، متروکات، محاسن و معائب سے خوب آشنائی ہو۔ چونکہ ہر تصنیف اپنے ترجمے کے لیے مختلف رویے کی متقاضی ہے، اس لیے مترجم پر فرض ہے کہ وہ علمی، ادبی اور صحافتی ترجمے میں امتیاز قائم رکھ سکے۔

علمی تراجم میں سائنسی علوم وفنون اور غیر ادبی تصانیف شامل ہیں۔ ایسے تراجم میں لفظ و اصطلاح کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور مترجم کی کوشش ہوتی ہے کہ اصطلاحات و تراکیب میں یکسانیت قائم رہے اور وہ مسلمہ اصولوں کے مطابق ہوں۔ ادبی تراجم میں شعر وسخن اور افسانوی نثر شامل ہیں۔ ان تراجم میں خیال کی درآمد کے ساتھ ساتھ مصنف کی رُوح اور زبان و بیان کی خوبیوں کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ صحافتی ترجمے میں وقتی ضرورتوں اور فوری ابلاغ پر توجہ دی جاتی ہے۔ اس میں زبان و بیان کی نزاکتوں کی جگہ خبر میں موجود معلومات کو قاری تک پہنچانے کو اوّلیت حاصل ہے۔

علمی، ادبی اور صحافتی تقسیم کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ترجمے کی تین اقسام ہیں۔ یعنی لفظی ترجمہ، آزاد ترجمہ اور معتدل ترجمہ۔ لفظی ترجمے کی بہترین مثال قرآنِ پاک کا اوّلین اردو ترجمہ ہے، جسے اہل نظر نے لفظی، بے محاورہ اور دُشوار قرار دیا ہے۔(۲۵) تاہم علوم وفنون میں لفظی ترجمے کو ہی ترجیح دی جائے گی۔ ہلال احمد زبیری کے خیال میں یہاں تو اصل کے ہر لفظ کے معنی اور اس کی اہمیت ترجمے میں حتی الامکان پوری طرح منعکس ہونی چاہیے، ورنہ مصنف نے دلائل و شواہد پیش کر کے جو نتائج اخذ کیے ہیں، اور ان کے اظہار و بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے، ترجمہ ان کا آئینہ دار نہیں ہو گا۔ علمی کتابوں کے مترجم پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنی فکر کو اصل مصنف کے فکری قالب میں ڈھال کر ہی اپنی ذِمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ علوم کا ترجمہ ہر

صورت میں لفظی ہونا چاہیے۔(۲۶) داستانوں ، افسانوں، کہانیوں، خاکوں اور ہلکی پھلکی نگارشات کے ترجمے کے لیے آزاد ترجمہ بہت موزوں تصور کیا جاتا ہے۔ ایسے تراجم میں عام طور پر مصنف کے خیالات مترجم کی فن کاری کی نذر ہو جاتے ہیں اور ترجمے میں مصنف کے افکار کے علاوہ سب کچھ موجود ہوتا ہے، چناں چہ مظفر علی سید کے الفاظ میں عام قسم کا لفظ بہ لفظ ترجمہ، جس میں اصل زبان کی زندگی مفقود ہو، یا ایسا رواں دواں اور آزاد ترجمہ، جس میں اصل کی تہ در تہ معنویت قربان ہو جائے، فنِ ترجمہ کی مشکلات سے ناآشنائی یا دانستہ گریز کا مظہر ہے۔(۲۷) تاہم معتدل ترجمہ ہی وہ منزل ہے، جہاں ایک مترجم نقال سے بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے اور وہ مصنف کے افکار و نظریات سے صرفِ نظر کیے بغیر ترجمے میں فنی و لسانی خصوصیات کا التزام کرتا ہے اور یوں اس کا ترجمہ تخلیق کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

☆☆☆☆

حواشی

۱۔ پروفیسر رشید امجد، فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مشمولہ رُوداد سیمینار..... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۴۲

۲۔ عطش درانی، فنِ ترجمہ..... اصول و مبادیات، مطبوعہ اخبارِ اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۵ء ص ۴ تا ۸

۳۔ فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ رُوداد سیمینار..... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۴۱

۴۔ دِل شاد کلانچوی، ترجمے کا فن..... نظری مباحث ۴۶ ق م تا ۱۹۸۶ء، ص ۱۰

۵۔ مشمولہ بیاضِ مبارک، مرتبہ سید زوار حسین زیدی، ص ۵۶

۶۔ ڈاکٹر اختر حسین اور ترجمے کا فن، مشمولہ افکار نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ص ۱۷۱

۷۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۴۸

۸۔ ڈاکٹر غلام علی الانہ، اختتامی اجلاس، مطبوعہ رُوداد سیمینار..... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۱۲

۹۔ فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ رُوداد سیمینار..... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۳۷ تا ۳۸

۱۰۔ تنقید اور تجربہ، ص ۱۲۵

۱۱۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۳۹ تا ۴۰

۱۲۔ فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ رُوداد سیمینار..... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۳۵

۱۳۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۵

۱۴۔ میرزا ادیب، کچھ ترجمے کے بارے میں، مطبوعہ نوائے وقت، راول پنڈی، ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء

۱۵۔ آلِ احمد سرور، نظر اور نظریے، ص ۲۵۰

۱۶۔ سید غفران الجلیلی، فنِ ترجمہ کے اصول و مبادیات، مطبوعہ اردو نامہ (سال نامہ) لاہور، مارچ ۱۹۸۲ء

۱۷۔ پی گرے، تحسینِ شعر (ترجمہ: ڈاکٹر روبینہ ترین) بہ حوالہ مغرب سے نثری تراجم از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ص ۲۴

۱۸۔ ترجمے کا فن..... نظری مباحث ۴۶ ق م تا ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۷

۱۹۔ انیس ناگی، تصورات، ص ۴۲

۲۰۔ مولوی عبدالحق ،مقدمۂ تاریخ یونان، (ترجمہ: سید ہاشمی فرید آبادی)، ص ۳

۲۱۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۱۶

۲۲۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، افسانوی ادب کے تراجم: مسائل اور مشکلات، مطبوعہ رُوداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۱۹۷ تا ۱۹۸

۲۳۔ مقدمہ مغربی تصانیف کے اردو تراجم، از مولوی میر حسن، ص ۵

۲۴۔ مظفر علی سید، فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ رُوداد سیمینار..... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۱۲

۲۵۔ نثار احمد قریشی، اردو میں نثری تراجم کی روایت کا مختصر جائزہ، مطبوعہ ترجمہ..... روایت اور فن، ص ۵

۲۶۔ ترجمے کا فن.....نظری مباحث ۴۶ ق م تا ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲

۲۷۔ مظفر علی سید، فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ رُوداد سیمینار..... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۴۰